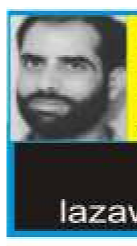

اردو ادب کا ایک سچا خادم گوپی چند نارنگ

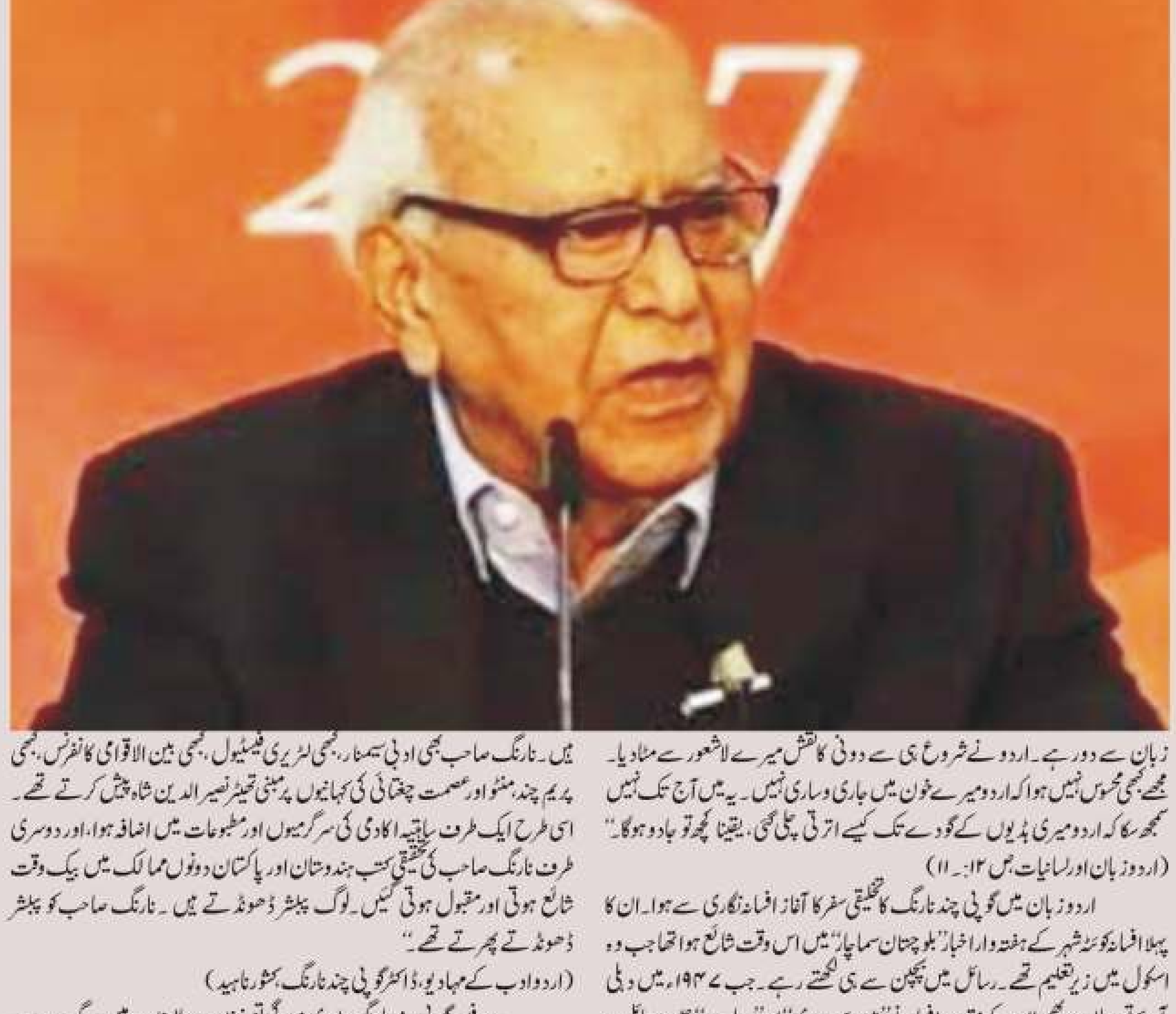

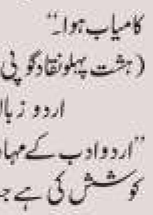

ڈاکٹر احسان عالم

ہندوستانی فکر و دانش کے سرچشمے جن علوم، مذاہب، تہذیبوں، زبانوں، علاقائی ثقافتوں، تاریخی اور سماجیاتی جدلیات سے پھوٹتے ہیں ان سب کے معتبر اسکالر اور شناور شخصیت کا نام گوپی چند نارنگ ہے۔

گوپی چند نارنگ کی شخصیت عالمی اردو ادب پر ایک جگمگاتے ہوئے آفتاب کی مانند ہے۔ اکیسویں صدی میں ان کی شخصیت صرف ایک فرد واحد کے طور پر تسلیم نہیں کی جاتی بلکہ ان کی شہرت و مقبولیت عالمی سطح پر نمایاں ہے۔ دنیا کے جن حصوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے وہاں وہاں گوپی چند نارنگ کا نام عزت و احترام سے لیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے عالمانہ خیالات، نظریات اور اپنی غیر معمولی ادبی خدمات کی بنا پر اردو ادب میں ایک انقلاب برپا کر رکھا ہے۔

گوپی چند نارنگ کی پیدائش ۱۱ر فروری ۱۹۳۱ کو تحصیل دکی ضلع لو الائی میں ہوئی۔ یہ جگہ بلوچستان میں واقع ہے۔ ان کے بزرگوں کا آبائی وطن مغربی پنجاب ضلع مظفر گڑھ ہے۔ یہاں ان کے خاندان صدیوں سے آباد تھے۔ اپنے بچپن کی حسین یادوں کو گوپی چند نارنگ نے نہایت ہی خوبصورتی اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے:

"کچھ یاد نہیں دکی کیسا گاؤں یا شہر تھا۔ البتہ موسیٰ خیل کے کچھ دھندلے سے نقش ذہن کی سلوٹوں میں ابھی باقی ہیں۔ تحصیل کے مکانوں کے پیچھے کا بڑا سا باغ جس میں انار، ناشپاتی اور شفتالو کے درخت اور انگور کی بیلیں تھیں۔ چاروں طرف چھوٹے بڑے پہاڑ مختصر سا بازار جس میں ڈاک کی لاری رکا کرتی تھی۔ سب بچے اسی میں چڑھ جاتے اور ڈاک گھر سے بازار تک کی سیر کرتے۔ مغرب میں پتھریلی سڑک تھی جو فورٹ سنڈے من کو جاتی تھی۔ اسی کے راستے میں ندی پر وہ پل تھا جس کے نیچے گہرے نیلے پانی میں ہم کنکر پھینکتے تو مچھلیوں کے سنہرے پر چمکنے لگتے۔" (فن اور شخصیت، آپ بیتی نمبر، ص ۳۸۳:)

فروری ۲۰۰۲ء میں گوپی چند نارنگ کو ساہتیہ اکیڈمی کا صدر چنا گیا۔ یہ بڑے فخر کی بات تھی کہ گوپی چند نارنگ ساہتیہ اکادمی دہلی میں اردو زبان کے پہلے صدر مقرر ہوئے۔ ان سے قبل آج تک اردو زبان کا کوئی بھی ادیب یا فنکار ساہتیہ اکادمی، دہلی کا صدر نہیں بنا تھا۔ اردو کے جتنے سیمینار گوپی چند نارنگ نے کروائے اس سے قبل اتنے سیمینار کبھی نہیں ہوئے تھے۔ ان سیمیناروں کی تاریخی اور ادبی حیثیت ہے اور یہ اردو ادب کا سرمایہ ہے۔ ان کے عہد میں یہاں سے زیادہ سے زیادہ کتابیں اردو میں شائع ہوئیں۔ وہ اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لئے ہمیشہ متحرک اور فعال رہے۔ ۲۰ر فروری ۲۰۰۸ء کو گوپی چند نارنگ ساہتیہ اکادمی کے صدر کے عہدے سے سبکدوش ہوگئے۔ ساہتیہ اکادمی کا صدر چنے جانے پر گوپی چند نارنگ کو اردو کے مشہور و معروف ادیب، ناقد، محقق، ناول نگار، مترجم اور جدیدیت کے سپہ سالار جناب شمس الرحمن فاروقی (اب ہمارے درمیان نہیں رہے) نے "شب خون" کے شمارہ نمبر ۲۶۵ میں مبارک باد پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان دلکش جملوں میں کیا:

"تمام دنیا کے اردو کے ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرت سے سنی جائے گی کہ اردو کے معروف دانشور، مفکر، ماہر لسانیات، نقاد اور اردو کی خدمت میں ہمیشہ سینہ سپر رہنے والے پروفیسر گوپی چند نارنگ کو بھاری اکثریت سے ساہتیہ اکادمی کا صدر منتخب کیا گیا ہے۔ اردو کے کسی ادیب کا ایسے بین اللسانی قومی ادارے کا سربراہ منتخب ہونا اس توقیر کی بھی دلیل ہے جو اردو کو ہمارے معاشرے میں حاصل ہے۔ ہم اپنے دوست کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ ان کے زمانہ انتظامیہ میں ساہتیہ اکادمی کا رشتہ اردو سے اور بھی استوار ہوگا۔"

اردو سے ان کا پیار لگاتار بڑھتا گیا۔ اردو ان کی مادری زبان نہ تھی لیکن اردو کو وہ مادری زبان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ اردو زبان کی کشش اور جادوئی اثر آہستہ آہستہ گوپی چند نارنگ کی رگوں تک اترتی چلی گئی اور آج اردو زبان ان کے خون میں جاری و ساری ہے۔ اردو صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک تہذیب ہے۔ نارنگ صاحب کی نظر میں تاج محل کا کرشمہ مثالی ہے لیکن اردو زبانوں کا تاج محل ہے۔ اس ضمن میں گوپی چند نارنگ اپنے عالمانہ خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اردو ہماری صدیوں کی تہذیبی کمائی ہے، یہ ملی جلی گنگا جمنی تہذیب کا وہ ہاتھ ہے جس نے ہمیں گڑھا، بنایا اور سنوارا ہے۔ یہ ہماری ثقافتی شناخت ہے جس کے بغیر نہ صرف ہم گونگے بہرے ہیں بلکہ بے ادب بھی۔ میں نے بار ہا کہا ہے کہ اردو کو محض ایک زبان کہنا اردو کے ساتھ بے انصافی کرنا ہے۔ یہ ایک طرز حیات : ایک اسلوب زیست، ایک انداز نظر یا جینے کا ایک سلیقہ و طریقہ بھی ہے، اس لیے کہ اردو صدیوں کے تاریخی ربط و ارتباط سے بنی ایک جیتی جاگتی زندہ تہذیب کا ایک ایسا روشن استعارہ ہے جس کی کوئی دوسری مثال کم از کم برصغیر کی زبانوں میں اردو میری مادری زبان ہیں، میری ددھیال اور ننھیال میں سرائکی بولی جاتی تھی، میری ماں دلی ہجرت کے بعد بھی سرائکی بولتی تھیں جو نہایت میٹھی، نرم اور رسیلی زبان ہے۔ لیکن مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میری مادری زبان سے دور ہے۔ اردو نے شروع ہی سے دوئی کا نقش میرے لاشعور سے مٹادیا۔ مجھے کبھی محسوس نہیں ہوا کہ اردو میرے خون میں جاری و ساری نہیں۔ یہ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ اردو میری ہڈیوں کے گودے تک کیسے اترتی چلی گئی۔ یقیناً کچھ تو جادو ہوگا۔"

(اردو زبان اور لسانیات، ص ۱۲۔۱۱)

اردو زبان میں گوپی چند نارنگ کا تخلیقی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا۔ ان کا پہلا افسانہ کوئٹہ شہر کے ہفتہ وار اخبار "بلوچستان سماچار" میں اس وقت شائع ہوا تھا جب وہ اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ رسائل میں بچپن سے ہی لکھتے رہے۔ جب ۱۹۴۷ء میں دہلی آئے تو یہاں پر بھی ان کے متعدد افسانے "بیسویں صدی" اور "ریاست" جیسے رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۵۳ء کے بعد گوپی چند نارنگ نے افسانہ نگاری کی دنیا کو ترک کر کے تحقیق و تنقید کی دنیا میں قدم رکھا۔ ان کا اولین مضمون "اکبر الہ آبادی سخن فہموں اور طرفداروں کے درمیان، رسالہ "نگار" میں جون ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ ان کا تخلیقی سفر آج تک جاری و ساری ہے۔

ان کی ادبی خدمات اور زندگی کی تگ و دو سے متعلق سے متاثر ہو کر اصغیر ندیم سید نے بڑے خوبصورت انداز میں چند جملے رقم کیے ہیں۔ ملاحظہ کریں:

"اردو شاعری اور نثر کی اصناف کو ریختہ، ہندوی سے لے کر اردو تک جس طرح نارنگ صاحب نے کھنگالا ہے۔ اس میں ہندوستان کے تمام خطوں کی خاک چھانتی پڑی۔ اور انہوں نے چھانی۔ بلوچستان سے سندھ تک، پنجاب سے راجستھان تک دلی سے کلکتہ تک اور گجرات سے بنگال تک یہ داستان گو چاروں کھونٹ گھوما اور بالآخر ہندوستانی تہذیب و ثقافت کے واضح اور شفاف سیکولر مزاج اور چہرے کو فکری سطح پر دریافت کرنے میں کامیاب ہوا۔"

(ہشت پہلو نقاد گوپی چند نارنگ، ص ۳۴:)

اردو زبان و ادب کی معروف ادیبہ کشور ناہید نے اپنے ایک مضمون "اردو ادب کے مہادیو : ڈاکٹر گوپی چند نارنگ" میں اس زمانے کی یاد کو تازہ کرنے کی کوشش کی ہے جب وہ ساہتیہ اکادمی کے سربراہ مقرر ہوئے تھے۔ ساہتیہ اکادمی کے صدر چنے جانے کا معاملہ میں نے بھی اپنی زبان میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں کشور ناہید کی زبانی سنئے:

"جس زمانے میں نارنگ صاحب ساہتیہ اکادمی کے سربراہ مقرر ہوئے، ابن انشا کا فقرہ سچ ہوگیا۔ وہ کہتا تھا کہ لاہور کے سات میلے مشہور ہیں مگر کشور سات دن میں آٹھ میلے کرواتی ہیں۔ نارنگ صاحب بھی ادبی سیمینار، کبھی لٹریری فیسٹیول، کبھی بین الاقوامی کانفرنس، کبھی پریم چند، منٹو اور عصمت چغتائی کی کہانیوں پر مبنی تھیٹر نصیر الدین شاہ پیش کرتے تھے۔ اسی طرح ایک طرف ساہتیہ اکادمی کی سرگرمیوں اور مطبوعات میں اضافہ ہوا، اور دوسری طرف نارنگ صاحب کی تحقیقی کتب ہندوستان اور پاکستان دونوں ممالک میں بیک وقت شائع ہوتی اور مقبول ہوتی گئیں۔ لوگ پبلشر ڈھونڈتے ہیں۔ نارنگ صاحب کو پبلشر ڈھونڈتے پھرتے تھے۔"

(اردو ادب کے مہادیو، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کشور ناہید)

پروفیسر گوپی چند نارنگ پوری زندگی تصنیفات و تالیفات میں سرگرم رہے۔ ان کی تنقیدی و تحقیقی اور مرتب شدہ نگارشات کی تعداد تقریباً تیرہ درجن کے قریب ہے۔ یہاں میں ان کی چند اہم اردو کتابوں کی فہرست قارئین کے سپرد کرتا ہوں:

۱۔ ہندوستانی قصوں سے ماخوذ مثنویاں۔	۱۹۶۱ء
۲۔ کرخنداری اردو کا لسانیاتی مطالعہ۔	۱۹۶۱ء
۳۔ اردو کی تعلیم کے لسانی پہلو	۱۹۶۲ء
۴۔ منثورات کیفی	۱۹۶۸ء
۵۔ آثار محروم	۱۹۶۹ء
۶۔ کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	۱۹۷۰ء
۷۔ ارمغان مالک (جلد اول و دوم)	۱۹۷۲ء
۸۔ املا نامہ) سفارشات املا کمیٹی اردو بورڈ	۱۹۷۴ء
۹۔ پرانوں کی کہانیاں (برائے نیشنل بک ٹرسٹ)	۱۹۷۶ء
۱۰۔ اقبال جامعہ کے مصنفین کی نظر میں وضاحتی کتاب	۱۹۸۰ء
۱۱۔ سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ	۱۹۸۰ء
۱۲۔ اردو افسانہ: روایت اور مسائل	۱۹۸۱ء
۱۳۔ انیس شناسی	۱۹۸۱ء
۱۴۔ سفر آشنا	۱۹۸۲ء
۱۵۔ اقبال کا فن	۱۹۸۳ء
۱۶۔ نئی کرن (برائے این سی آر ٹی، باشتراک)	۱۹۸۳ء
۱۷۔ نئی روشنی (برائے این سی آر ٹی، باشتراک)	۱۹۸۳ء
۱۸۔ پڑھو اور بڑھو (برائے این سی آر ٹی، باشتراک)	۱۹۸۳ء
۱۹۔ وضاحتی کتابیات (جلد دوم، باشتراک)	۱۹۸۴ء
۲۰۔ لغت نویسی کے مسائل	۱۹۸۵ء
۲۱۔ اسلوبیات میر	۱۹۸۵ء
۲۲۔ اردو کی نئی کتاب (درجہ۔ ۹) (باشتراک)	۱۹۸۶ء
۲۳۔ انتظار حسین کے بہترین افسانے	۱۹۸۶ء
۲۴۔ نیا اردو افسانہ: تجزیہ و مباحث	۱۹۸۸ء
۲۵۔ ادبی تنقید اور اسلوبیات	۱۹۹۱ء
۲۶۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام	۲۰۰۲ء
۲۷۔ بلونت سنگھ کے نئے افسانے	۱۹۹۶ء
۲۸۔ ذاکر حسین : حیات و خدمات	۱۹۹۸ء
۲۹۔ مابعد جدیدیت پر مکالمہ	۱۹۹۹ء
۳۰۔ اردو غزل اور ہندوستانی ذہن و تہذیب	۲۰۰۲ء

یہاں میں نے گوپی چند نارنگ صاحب کے کچھ کتابوں کے نام اور سن اشاعت درج کئے ہیں۔ ان تصنیفات و تالیفات سے گوپی چند نارنگ کی تحقیقی اور تنقیدی بصیرت کا بخوبی علم ہوتا ہے۔ نارنگ صاحب پوری زندگی اردو کی خدمت میں دل و جان سے لگے رہے۔ ان کی ادبی خدمات پر ہندوستان اور دیگر ملکوں نے انہیں بہت سے انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ ایک مختصر سی جھلک ان کو ملنے والے کچھ خاص ایوارڈ و اعزازات پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ غالب پرائز، حکومت اتر پردیش	۱۹۶۲ء
۲۔ فیلو رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن	۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۰ء تک
۳۔ کامن ویلتھ فیلوشپ برائے ہندن یونیورسٹی	۱۹۶۳ء
۴۔ اردو اکادمی اتر پردیش انعام	۱۹۷۲ء
۵۔ میر ایوارڈ میر اکادمی لکھنؤ	۱۹۷۷ء
۶۔ نیشنل ایوارڈ (ان۔ سی۔ آر۔ ٹی) نئی دہلی	۱۹۷۷ء
۷۔ انعام بہار اردو اکادمی	۱۹۷۹ء
۸۔ خصوصی ایوارڈ بہار اردو اکادمی	۱۹۸۵ء
۹۔ ساہتیہ کلا پریشد دہلی ایوارڈ	۱۹۸۴ء
۱۰۔ غالب ایوارڈ، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی	۱۹۸۵ء
۱۱۔ انٹرنیشنل ایوارڈ، اردو سوسائٹی ٹورنٹو، کنیڈا	۱۹۸۷ء
۱۲۔ صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے "پدم شری"	۱۹۹۰ء
۱۳۔ خصوصی ایوارڈ برائے تنقید و تحقیق، دہلی اردو اکادمی	۱۹۹۱ء
۱۴۔ اعزاز میر، میر اکادمی لکھنؤ	۱۹۹۳ء
۱۵۔ راجیو گاندھی ایوارڈ برائے سیکولرزم	۱۹۹۴ء
۱۶۔ پدم بھوشن	۲۰۰۴ء
۱۷۔ ساحر لدھیانوی ایوارڈ	۲۰۰۵ء
۱۸۔ یوروپین اردو رائٹرس ایوارڈ، لندن	۲۰۰۵ء
۱۹۔ ڈی لٹ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی	۲۰۰۸ء
۲۰۔ بہادر شاہ ظفر ایوارڈ	۲۰۱۰ء
۲۱۔ اقبال سمان مدھیہ پردیش اردو اکادمی	۲۰۱۱ء

یہاں صرف چند ایوارڈ اور اعزازات کی فہرست پیش خدمت ہے۔ کل ملا کر انہیں پچاس سے زیادہ انعامات و اعزازات مل چکے ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے پیش نظر اتنے انعامات و اعزازات سے نوازا جانا ان کی عظمت کی نشاندہی کرتا ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اردو کی نئی بستیوں گوپی چند نارنگ کی شہرت ہے۔ گوپی چند نارنگ اپنی ادبی خدمات کے ضمن میں مشتاق صدف کے ذریعے لئے گئے انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"میں اردو کا خادم ہوں۔ اردو میری ضرورت ہے، میں اردو کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو کسی بھی کام کو شہرت کے لئے نہیں کرتے۔ اگر لوگ میری باتوں پر دھیان دیتے ہیں یا جو کچھ میں کہتا ہوں اس کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہے تو یہ میرے قارئین کی محبت ہے۔ اردو سے میرا معاملہ عشق کا ہے اور عشق میں سود و زیاں نہیں ہوتا۔ آپ اسے شہرت کہتے ہیں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری مخالفت بھی ہوتی ہے اور کبھی بار بغض و عناد کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ اگر آپ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور اس کی پروا نہیں کرتے ہیں کہ آپ کے علمی موقف سے کون خوش ہوگا اور کون ناخوش تو دوسروں کی مصلحتوں پر ضرب بھی پڑتی ہے۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ مسئلہ علمی ہے لیکن لوگ ذاتی سطح پر اتر آتے ہیں لیکن میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا۔" (جدیدیت کے بعد، ص ۵۵۰:) مختصر طور پر یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اپنی تخلیقات و تالیفات کی روشنی اور ادبی خدمات کی بنا پر گوپی چند نارنگ جیسا کشادہ ذہن اور وسیع المطالعہ تخلیق کار بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ ایک شعر کے ساتھ اپنی بات ختم کرتا ہوں:

یہ سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں اپنے کوئی ان سا بھی کہاں ہے

گوپی چند نارنگ اور افسانے کی تنقید

قسط اول

ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی

اردو زبان و ادب میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کے کارنامے کثیر الجہات ہیں۔ وہ نہ صرف یک بلند پایہ مفکر، محقق اور ممتاز دانشور ہیں بلکہ نابغہ روزگار نقاد بھی ہیں۔ وہ نظریہ ساز ادیب و فنکار بھی ہیں اور عہد ساز شخصیت کے مالک بھی۔ وہ ادب کے بدلتے ہوئے رجحانات اور رویوں سے نہ صرف یہ کہ پوری طرح باخبر رہتے ہیں بلکہ ان رجحانات کے ساتھ ساتھ خود کو بھی بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جمود و سکون کے قائل نہیں یہی وجہ ہے کہ وہ ادبی منظرنامے پر ہمیشہ تازہ دم نظر آتے ہیں اور نئی پرانی دونوں نسلوں کو ہر جدید اور تازہ نظریہ پر کھل کر گفتگو کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے تصنیف و تالیف اور فکر و فلسفہ کے علاوہ ہندوستان میں اردو کے اتنے عظیم الشان اور یادگار سیمینار منعقد کروائے ہیں جو نہ صرف تاریخی نوعیت کے حامل رہے ہیں بلکہ ان سے ادب کی نئی نئی راہوں پر چلنے اور منزل تک رسائی حاصل کرنے میں آسانی فراہم ہوتی ہے۔ ان سے ایک پوری نسل کے ذہن و دماغ کی آبیاری ہوئی ہے اور ادبی فضا کو تابناکی و روشنی حاصل ہوئی ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا پروفیسر نارنگ ایک ہمہ گیر اور کثیر الجہات شخصیت کا نام ہے اردو تنقید کے میدان میں بھی ان کی جہتیں مختلف ہیں جن میں اردو شاعری، اردو نثر، اسلوبیات، ساختیات اور لسانیات کے ساتھ ساتھ ان کا پسندیدہ میدان "اردو افسانہ" بھی رہا ہے۔ اردو تنقید کی تاریخ میں زیادہ تر شاعری کی تنقید سے ہی سروکار رکھا گیا ہے یعنی ادب کے مطالعے میں شاعری کو بنیادی حیثیت حاصل رہی اور فکشن کو ثانوی مقام بھی مشکل سے دیا گیا۔ اسکی وجہ شاید یہ ہے کہ شاعری کی بہ نسبت فکشن کی تنقید زیادہ مشکل، پیچیدہ اور محنت طلب عمل ہے۔ پروفیسر نارنگ کے لفظوں میں :

"اچھے شعر کا معاملہ نسبتاً اتنا مشکل نہیں، اچھی کہانی کے ساتھ بہت کچھ جھیلنا پڑتا ہے"

اس کا مطلب یہ قطعی نہیں کہ شاعری یا اس کی تنقید کم مایہ ہوتی ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ و تہذیب نے وہ مخصوص ذہن پیدا کر دیا ہے کہ اردو ادب کی تفہیم و تعبیر کا عمل شاعری سے شروع ہوتا ہے اور اکثر شاعری پر ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن پروفیسر گوپی چند نارنگ نے جو تنقیدی منظرنامے پر ہمیشہ جدید تر اور تازہ دم دکھائی دینے کے قائل ہیں اپنی مخصوص افتاد طبع کی وجہ سے شاعری کی بجائے افسانے پر زیادہ توجہ کی ہے۔ انہوں نے افسانے پر زیادہ لکھا ہے اور اس انداز سے لکھا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ فکشن کی تنقید ہی ان کا اصل میدان ہے۔ انہوں نے پریم چند، بیدی، کرشن چندر، انتظار حسین، سریندر پرکاش، بلراج مینرا، منشا یاد، سلام بن رزاق اور کئی دوسرے فکشن نویسوں کے بارے میں جس انداز سے لکھا ہے وہ افسانے پر ان کی شدید گرفت کا آئینہ دار ہے۔

افسانے سے اپنی خاص دلچسپی کے باعث پروفیسر نارنگ کئی بار اہم سمینار اور مذاکرے کا بھی اہتمام کر چکے ہیں جن میں "اردو افسانہ روایت اور مسائل" (۱۹۸۰) اور "نیا اردو افسانہ تجزیے اور مباحث" (۱۹۸۵) کے عنوانات سے ہونے والے دو سمینار اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور اہم تھے جن سے اردو افسانہ پر گفتگو کے نئے دروازے کھلے اور جنہوں نے اردو افسانہ کو نئی منزلوں سے روشناس کیا۔ اس لئے گوپی چند نارنگ کی افسانوی تنقید پر جب بھی گفتگو کی جائے گی ان سمیناروں کا حوالہ ناگزیر ہوگا۔ "اردو افسانہ روایت اور مسائل" میں گوپی چند نارنگ نے پہلی بار جدید افسانے کو درپیش چند بنیادی سوالات اور پیچیدہ مسائل پر غور و فکر کی دعوت دی۔ انہوں نے سمینار کی مرتبہ کتاب کے ابتدائیے میں لکھا ہے کہ :

"جدید افسانے کے اظہاراتی تجربے، فنی بلندیاں اور نئے نئے مسائل ہیں جو قابل غور ہیں۔ نیا افسانہ دراصل اس وقت ایک ایسے دوراہے پر کھڑا ہے جہاں اس کو خود نہیں معلوم کہ اس کی اگلی منزل کیا ہے؟"

"نئی کہانی نے نہایت بے رحمی سے فرسودہ ڈھانچے سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کیا نئی کہانی جس حد تک وہ نئی ہے کہانی نہیں ہے؟ یا جس حد تک وہ کہانی ہے نئی نہیں ہے؟ کیا کہانی کا کہانی پن فرسودہ ڈھانچہ کا ایسا عنصر ہے جس کی رد لازم ہے؟ کہانی خواہ وہ کتنی ہی ابہام، تجریدی، استعاراتی، تمثیلی، علامتی یا لفظ سیاتی ہو کیا کہانی پن کے بغیر اس کی تشخیص ممکن ہے؟"

"نئی کہانی زمان و مکان کے منطقی رشتوں کو لاشعوری سطح پر بدل دینے پر قادر سہی، لیکن زمان و آسمان کی وسعتوں میں اسے کہیں تو پیر ٹکانے ہی پڑتے ہیں اور کسی نہ کسی لمحے میں سانس تو لینی ہی پڑتی ہے۔ کہانی کتنی ہی آفاقی اور باطنی ہو کیا واضح یا پوشیدہ طور پر وہ ہمیشہ سماج اور معاشرے سے جڑی نہیں رہتی؟"

پروفیسر نارنگ کے قائم کردہ یہ سوالات خود ساختہ نہیں تھے بلکہ اس عہد کے بدلتے ہوئے افسانوں کے بطن سے پھوٹ رہے تھے۔ نئے افسانہ نگاروں کے سامنے افسانہ سے زیادہ ان کی اپنی شناخت ان کا اپنا تشخص ہی داؤ پر نظر آ رہا تھا۔ اردو افسانے کی مہتم بالشان روایت کے برخلاف ان کے پاس نہ تو زبان تھی اور نہ تیز اور گہرا مشاہدہ، اہل فکر و نظر بھلا ان کی طرف کیونکر متوجہ ہوتے؟ کچھ علامتوں، استعاروں اور بے ربط تشبیہوں کی بیساکھی سے وہ کتنی دور چل سکتے تھے؟ اس لئے چند نقادوں اور برگزیدہ مدیروں کی پشت پناہی کے باوجود وہ مستقبل کی تاریکی خطرات اور خدشات کو محسوس کر رہے تھے۔ پروفیسر نارنگ نے اس سمینار کے ذریعہ ان کے محسوسات کو عملی شکل میں دیکھنے کی کوشش کی اور ۱۹۶۰ء کے نئے اردو افسانے کے مسائل کو سنجیدگی سے سمجھانے کی سعی کی۔ اس سمینار کا سب سے اہم مضمون پروفیسر نارنگ کا مقالہ "نیا افسانہ، روایت سے انحراف اور مقلدین کے لئے لمحہ فکریہ" ہے جو اپنے عنوان سے لے کر اختتام تک معنی خیز ہے۔ اس میں انہوں نے علامتی اور استعاراتی انداز کو تحسین نگاہوں سے دیکھا ہے لیکن اس ضمن میں صرف قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، غیاث احمد گدی، کلام حیدری، عبداللہ حسین جیسے چند افسانہ نگاروں کو ہی اہمیت دی ہے۔ ان کے خیال میں باقی لوگوں نے علامت و استعارہ کے نام پر پیچیدگی اور ژولیدہ بیانی کو ہی افسانہ سمجھ لیا ہے۔ ان کے لفظوں میں :

"جو بات تشویش ناک ہے وہ اوسط درجے کی ذہنیت Mediocrity کی یلغار ہے، جس کے باعث علامتی اور تمثیلی کہانی کے مقلدین کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ان کے ہاتھوں اس کہانی کے مستقبل کو شدید خطرہ درپیش ہے۔ اب علامتی تمثیلی کہانی بھی ایک فیشن اور فارمولا بن گئی ہے اور بہت سے نئے لکھنے والوں نے اسے رواجاً اختیار کر رکھا ہے۔ اس سے نئے لکھنے والوں کی تخلیقیت اور نئی کہانی دونوں کو نقصان پہنچا ہے۔" (اردو افسانہ روایت اور مسائل ص۔ ۴۷)

اس کا یہ مطلب نہیں کہ پروفیسر نارنگ تجربات کے مخالف ہیں۔ وہ ہر تجربہ کو خوش آمدید کہتے ہیں مگر ایسا تجربہ جو صحت مند ہو اور کسی نہ کسی سطح پر روایات سے جڑا ہوا ہو۔ ایسا تجربہ ان کے نزدیک مستحسن نہیں جس میں روایت کی پاسداری ہی نہ ہو۔ پروفیسر نارنگ کا کہنا ہے کہ علامت یا استعارہ یا اس طرح کے دوسرے اوزار جب کسی مشاق اور ہمہ جہت فنکار کے ہاتھوں آتے ہیں تو فن کی دنیا سنور جاتی ہے اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو تجریدی، لایعنی اور لفظی بازیگری بہت دنوں تک نہیں چل سکتی۔ اس لئے جو کہانی مختصر افسانے کی موت کے ساتھ شروع ہوئی تھی اور جس نے خود کو بیانیہ کی روح سے آزاد کر کے زندہ رہنے کی کوشش کی تھی وہ اپنی موت آپ مر رہی ہے۔ جبکہ ۱۹۸۰ کے بعد کی کہانی اپنے طمطراق کے ساتھ، زندگی کے مسائل کے بیان کے ساتھ اور بیانیہ کے تاثر اور سحر کے ساتھ یوں آگے بڑھ رہی ہے کہ اس کا رشتہ روایت سے بھی جڑا ہوا ہے اور نئے تقاضوں اور نئے ادبی معیاروں کی ہر کسوٹی پر بھی کھری اتر رہی ہے۔ انہوں نے بڑے واضح انداز میں لکھا تھا کہ : "یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ادب میں کتنی اور کیسی ہی تبدیلیاں کیوں نہ آئیں ادب کا گہرا رشتہ ہمارے اجتماعی لاشعور کے صدیوں پرانے تقاضوں، نسلی اثرات اور تہذیبی مزاج و افتاد طبع سے ضرور رہے گا۔ چنانچہ ایک ایسے معاشرے میں جو پنچ تنتر اور کتھا سرت ساگر کی دھرتی سے تعلق رکھتا ہو اور جس کی ذہنی تشکیل میں الف لیلیٰ، طلسم ہوشربا اور حکایات گلستاں کا بھی حصہ رہا ہو اس میں کہانی کسی سے نئی کیوں نہ ہو جائے وہ کہانی پن سے کلیتاً دامن کیسے چھڑا سکتی ہے۔ ایسا کرنے سے خدشہ ہے کہ خود کہانی کو نقصان پہنچے گا۔ چنانچہ اردو میں اس وقت یہی ہو رہا ہے۔"

(اردو افسانہ روایت اور مسائل ص۔ ۱۴۷)

اس اقتباس بلکہ اس پورے مضمون سے گوپی چند نارنگ کے جن خیالات تک رسائی ہوتی ہے وہ یہ کہ وہ نئے افسانے کے کل سرمائے سے مطمئن نہیں تھے۔ کہانی سے کہانی پن اور بیانیہ کے اخراج کو غیر تخلیقی عمل تصور کرتے ہیں اور یہ تسلیم کرتے ہیں کہ علامتی، استعاراتی، تمثیلی یا تجریدی کہانی لکھنا ہر کس و ناکس کے بس میں نہیں۔ اس فیشن سے افسانے کو نقصان پہنچا ہے۔ یہ مضمون اردو افسانے کی واپسی کا پیش نامہ تھا اور اس سمینار کے بعد ہی سے تجریدی یا انام کہانی لکھنے کا رواج تیزی سے کم ہوتا گیا۔

اس کے بعد آٹھویں دہائی یا اس سے کچھ پہلے اور بعد کے ابھرنے والے افسانہ نگاروں کی شناخت قائم کرنے کے لئے پروفیسر نارنگ نے دوسرا بڑا سمینار ۱۹۸۵ء میں منعقد کیا جس میں پانچ روز تک افسانوں اور ان کے تجزیوں کا دور چلتا رہا۔ پانچ دن میں کل بائیس ۲۲ر افسانے پڑھے گئے اور ان افسانوں کے بائیس ۲۲ر تجزیے کئے گئے۔ آخر میں نئے افسانے کی صورت حال اور بنیادی سوالات و مباحث کے لئے خصوصی اجلاس رکھا گیا تھا جس میں نئے افسانے پر غور و فکر اور گفتگو کے ذریعہ اس کی تفہیم و تعبیر کا نیا معیار قائم کیا گیا اور نئی کہانی میں "بازآبادکاری" کو "نئی حقیقت نگاری" سے تعبیر کیا گیا۔ اس سمینار کی مرتبہ کتاب "نیا اردو افسانہ۔ انتخاب، تجزیے اور مباحث" میں پروفیسر نارنگ کا مضمون "نیا افسانہ علامت، تمثیل اور کہانی کا جوہر" بھی کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ مضمون جہاں ضخامت کے اعتبار سے وسیع ہے وہیں اہمیت و افادیت کے لحاظ سے بھی وقیع ہے۔ اس کی تمہید میں پروفیسر نارنگ نے اپنے سابقہ تجربات، مشاہدات، قیاسات، معروضات اور مفروضات کی روداد بیان کی ہے اور نئی کہانی کی تعریف و تشریح بھی اس کے ارتقائی روشنی میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"نئی کہانی نے اپنی سب سے بنیادی پہچان تصور حقیقت اور اظہار کے پیرایوں میں تبدیلی سے کرائی ہے۔ یعنی لفظ نرے لفظ نہیں تھے بلکہ ایسے استعاروں اور علامتوں کے طور پر استعمال ہونے لگے جن کے مفاہیم کو منطقی طور پہ Paraphrase کرنا ممکن نہیں۔ فرد کی فردیت، اس کے معمولی پن میں اس کی Uniqueness، چھوٹے چھوٹے دکھ سکھ اور بنیادی صداقتیں یعنی زندگی کی نوعیت اور ماہیت، خوشی اور غم کی حقیقت، وجود کا اختیار اور جبر، جنس کی سچائی، عرفان ذات کی دہشت نیز طرح طرح کے موضوعات کی رنگارنگی کہانی کی دنیا میں اپنی کیفیت دکھانے لگی۔ کہانی کی قدر شناسی کی سطح پر بڑی تبدیلی یہ آئی کہ موضوع سے چونکہ ادب کی تشکیل نہیں ہوتی اس لئے موضوع اور اظہاری پیکر سے مل کر جو تخلیقی وحدت وجود میں آتی ہے وہ افسانہ ہے۔" (نیا اردو افسانہ تجزیے اور مباحث ص۔ ۴۶)

بعض لوگوں نے جس طرح افسانہ اور شاعری کی سرحد کو دھندلا دیا تھا اس پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ نئی کہانی تکنیک کے مرحلے سے گزر رہی ہے جس سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اس تکنیک کی وجہ سے تقلید کا میلان خود بھی اپنے جواز کی بازآفرینی میں سرگرداں ہے۔ واضح علامات کا مرحلہ تخلیق فن کے مرحلے سے کم یا الگ نہیں ہوتا علامت سازی پر عبور اس فنکار کو ہی ہو سکتا ہے جس کی حیثیت مجتہد العصر کی ہو مقلدین صرف تقلید کر سکتے ہیں۔ اس لئے جنہیں سیدھی سادی کہانی لکھنے پر بھی عبور حاصل نہیں انہیں علامتی کہانی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ تقلید کے چکر میں پڑ کر اکثر فنکار ذہنی ژولیدگی کا شکار ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں :

"علامتی کہانی کے نام پر اس طرح کی بے مزہ تحریریں اتنی بڑی تعداد میں شائع ہوئی ہیں کہ مقلدین کی اس یلغار سے علامتی کہانی کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔" (نیا اردو افسانہ، ص۔ ۴۷)